Date of Publication: 02-12-2013 PRICE Rs. 2/-

POSTED 03-04- Dec. 2013
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U (C)160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

8-14 December 2013 — ۸تا ۱۴ر دسمبر ۲۰۱۳ء

Issue: 46, Vol.: 72 — شمارہ نمبر: ۴۶، جلد نمبر: ۷۲

دارا شکوہ کی شاعری

شمس الرحمن فاروقی

(سی-۲۹، ہیسٹنگ روڈ، الہ آباد-۲۱۱۰۰۱)

انگریزی سے ترجمہ: سرور الہدیٰ

یہ یقیناً خوشی کی بات ہے اور جشن منانے کا موقع بھی کہ انجمن نے ۱۹۰۳ء میں اپنے قیام کے صد سالہ جشن کے بعد اپنی تاریخ کی دوسری صدی کے پہلے عشرے میں، اب جب کہ دارا شکوہ کی چار سو ویں صدی اور ایک ہے تو اسے یاد کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ دارا شکوہ وہ عظیم انسان ہے جو اگر زندہ رہ گیا ہوتا تو تخت نشین ہو کر عظیم شخص ہی کہلاتا۔

دارا شکوہ کی ولادت ۲۰ مارچ ۱۶۱۵ء کو ہوئی۔ پوری دنیا میں نہ سہی، ہند، سندھ اور دکن کے اس علاقے میں تو وہ یقیناً سب سے زیادہ بلند اقبال (privileged) انہ تو شخص یہ تھا کہ اس جلد ہی اس کا باپ شاہجہاں ہونے والا تھا۔ دارا شکوہ کی ولادت انا ساگر جھیل کے کنارے ہوئی۔ انا ساگر اور اجمیر شہر دونوں کو حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی نسبت سے، جو آج تک انتہائی محبوب مسلم صوفی ہیں، ایک متبرک مقام کی حیثیت حاصل تھی۔ دارا نے زندگی کے آخری وقت تک محفوظ زندگی بسر کی۔ اس کے برعکس، اورنگ زیب جو جنگ اور حکومت کے فن میں حاذق تھا اس نے وراثت کی جنگ میں دارا کو شکست دی، اور ایسی جنگیں مغلوں میں آئے دن کا معمول تھیں، اس نے دارا کو بے یار و مددگار اور بے حرمتی کے ساتھ مروا دیا۔

کشن چند اخلاص نے اپنے فارسی کے ایک شعر میں دارا کو 'گلابوں کے شاہی باغ کا پہلا گلاب' کہا ہے جس سے مترشح ہوتا ہے کہ اگر سب نہ سہی تو کچھ لوگ یہ ضرور سمجھتے تھے کہ دارا تخت سلطنت پر اپنے باپ شہنشاہ خرم کی جگہ لے گا جب کہ ابھی خود خرم بادشاہ نہیں ہوا تھا اور تخت سلطنت پر اپنے باپ جہانگیر کی جگہ بیٹھنے میں اسے بارہ سال کا عرصہ درکار تھا۔

جب ۳۰ اگست ۱۶۵۹ء کو دارا شکوہ مارا گیا تو اسے ایک شہید تصور کیا گیا۔ کشن چند اخلاص نے ایک شعر کا خوب صورت مصرع نقل کیا ہے جس سے دارا شکوہ کی تاریخ وفات برآمد ہوتی ہے۔ اس مصرعے کا ادبی حسن لفظ 'دارا' کی ان مختلف تعبیرات میں مضمر ہے جن کا اطلاق یہاں ہوتا ہے۔ دارا نام ہے مرحوم شہزادے کا، اس مرحوم ایرانی شہنشاہ کا بھی جو دارا کے نام سے موسوم ہے اور جسے انگریزی اور یونانی میں Darius کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ لفظ دارا کے معنی ہیں حامل، مالک، آقا، حاکم۔

بیشتر مورخین دارا اور اورنگ زیب کی شخصیتوں کی نشان دہی میں الجھن کا شکار ہوتے ہیں۔ دراصل دونوں میں بہت سی باتیں مشترک تھیں اگرچہ دارا کے مقابلے میں اورنگ زیب کو اپنے باپ کی زیادہ خصوصیات ورثے میں ملیں۔ اورنگ زیب اور اس کے باپ کی جسمانی ساخت اور شکل و شباہت میں ایک پراسرار قسم کی یکسانیت تھی۔ اورنگ زیب کو اپنے باپ سے ورثے میں سختی ملی تھی جب کہ دارا شکوہ اپنے باپ اور بھائی کے مقابلے میں ایک دوسری قسم کا انسان تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ اورنگ زیب یا شاہجہاں کو شعر و شاعری یا تحصیل علم سے کوئی شغف نہیں تھا۔ اگر میں غلط نہیں ہوں تو اورنگ زیب شاید شاعری کے معاملے میں دارا سے زیادہ وسیع المطالعہ تھا، ویسے ہی جیسے فلسفیانہ تصوف اور

ویدانت میں دارا کا علم اورنگ زیب سے کہیں وسیع تھا۔

بیشتر مورخین نے اس امر کی نشان دہی کی ہے کہ دارا کے مزاج میں سب سے نمایاں پہلو ایک تو اس کی متحمل اندازی اور دوسرے اس کا یہ مزاج تھا کہ وہ کسی خوش آمد پسندی سے کسی بھی چیز کو قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔

سترہویں اٹھارویں صدی کے ایک شاعر محمد افضل سرخوش نے اپنے تذکرے کلمات الشعرا (۱۶۸۲ء) میں ایک روایت نقل کی ہے۔ اگر اس روایت کو معتبر مان لیا جائے تو اس کی رو سے دارا شکوہ نے اپنے ایک درباری مسخرے حاجی مسکین کو اس وقت معزول کر دیا تھا جب اس نے بھرے دربار میں خود دارا شکوہ اور اس کے بیٹے شاہزادہ سلیمان شکوہ کے بارے میں ایک بیہودہ مذاق کیا تھا۔ اورنگ زیب اور دارا کی شخصیتوں کا موازنہ کریں تو سب سے پہلے دونوں کے ایک دوسرے سے مختلف ہونے کی بات ہے۔ دارا کی بدقسمتی یہ ہے کہ اس کے آخری دن اور اس کی موت جس طرح ہوئی اس نے اس کے نام کے ساتھ مظلومیت اور المیے اور رومان کا ایک ایسا ہالہ بنا دیا جس کو چیر کر نظریں اس کے آر پار کی خوبیوں کو نہیں دیکھ سکیں۔ یہ وہ ہالہ تھا جس کی وجہ سے نہ صرف عوام الناس بلکہ مغل تاریخ کا بہت کچھ علم رکھنے والے طالب علم بھی پوری طرح دارا شکوہ کو صحیح داد دینے سے قاصر رہے اور اس بات کی بھی کہ اسے ویدانت، تصوف اور فلسفے پر کس قدر عبور حاصل تھا۔ دارا شکوہ کی دانشورانہ فتوحات سے متعلق لوگوں کی لاعلمی کا یہ عالم ہے کہ ہم میں سے بہت سے یہ تک نہیں جانتے کہ وہ فارسی کا ایک سنجیدہ شاعر تھا جس کا شاعرانہ مرتبہ لال قلعے کی عام شعری روایت سے منسلک بہت سے اہم پیش رو مغل شہزادوں سے کہیں بلند تھا۔ ہم میں سے چند ہی لوگ جانتے ہیں کہ بحیثیت شاعر اس کا تخلص قادری تھا اور اس کا ایک بہت ہی مختصر لیکن اہم قدر و قیع شعری مجموعہ بھی ہے۔

میری نظر میں ابھی چند ہی تحریریں ہیں جہاں دارا شکوہ کے شعری مرتبے کا جائزہ لیا گیا ہے۔ انھی میں سے ایک مقالہ علی گڑھ کے آصف نعیم صدیقی کا بھی ہے۔ تاہم ان تحریروں میں دارا شکوہ کی شاعری کو زیادہ وقعت نہیں دی گئی ہے۔ آصف نعیم نے اس بات پر زور دیا ہے کہ دارا شکوہ کی شاعری دراصل اس کے زمانے کی فارسی شاعری کی اصل روش سے ہٹ کر ہے اس لیے اگرچہ یہ شاعری اس سبک ہندی (فارسی کے ہندی اسلوب) کی نمائندگی نہیں کرتی جو اکبر کے زمانے سے فارسی شاعری کا مروجہ اسلوب تھا۔

بالشبہ قاری کے ذہن پر دارا شکوہ کی شاعری کا یہی تاثر قائم ہوتا ہے کہ اپنے لب و لہجے کے اعتبار سے یہ چارہ نسخے کی شاعری ہے۔ ایک سخت گیر استاد کی طرح اپنے اس رویے کی وجہ سے شاعر دارا شکوہ اپنے قاری کو ہمیشہ صلاح دیتے اور نصیحت کرتے ہوئے جچتے ہیں۔ اس کے علاوہ معدودے چند موضوعات ایسے بھی ہیں جن پر وہ نمایاں طور پر زور دیتے ہیں۔ ان گنے چنے موضوعات میں جن میں ایک طرح کی سطحیت اور تکرار ہے، بشر کے مرتبے اور فوق البشر سے اس کے رشتے کی بات کی گئی ہے۔ لیکن عام قاری کی نظر دارا شکوہ کے کلام میں جو کچھ دیکھتی ہے اس میں اس سے بھی زیادہ کچھ اور ہے۔ دارا شکوہ یقیناً اپنے زمانے کے نامور شعرا مرزا رضی دانش یا ابو طالب کلیم کا ہم سر تو نہیں لیکن اس کی تعریف سرسری سے ایک دو پیراگرافوں میں یہ کہہ کر بھی نہیں کی جا سکتی کہ وہ خاندان مغلیہ کے ان بہت سے نامی شہزادوں میں سے ایک تھا جنھوں نے اپنے فرصت کے اوقات میں شاعری بھی کی، اگر ایسی فرصتیں کبھی ان کو میسر آسکیں تو۔

پہلی بات تو یہ کہ قادری (دارا شکوہ) فارسی زبان کا ماہر تھا۔ درحقیقت ایک ہی شاعر ایسا ہے جس کی شاعری ہمیں رومی کی یاد دلاتی ہے اور محض رومی کے متصوفانہ موضوعات کے سبب نہیں بلکہ اپنی بھرپور قوت اظہار کی بنا پر۔ بدقسمتی سے ایرانیوں سے زیادہ ہندوستانیوں میں لائق احترام خسرو کو چھوڑ کر ایسے بہت سے شاعر ہیں جن کو بول چال کی اور بامحاورہ فارسی پر قدرت حاصل نہیں تھی۔ اگر کسی نے اہل زبان کی طرح کچھ لکھا ہے تو وہ دارا شکوہ تھا۔ دارا شکوہ کی سب سے پہلی غزل جس میں ویدانت کا تصور بیان کیا گیا ہے اور جس میں اگرچہ کچھ اثر شیخ محی الدین ابن عربی کا بھی ہے جو محب اللہ الہ آبادی کی تعلیم کی وجہ سے ہے اس سے نہ صرف زبان پر بے پناہ عبور کا پتا چلتا ہے بلکہ پختگی کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ غزل یہ ہے:

ہست موجود در وجود ما
ہیچ گل است این وجود ما
گر ببو در بود و ما ہم آواز
شد آں تے ظاہر این مردود
تو بیام ہیچ نیم نبود
غیر محمود در شہود ما
وہم دوئی شود ز ما دوئی
ہست باقی ہمہ وجود ما
ہر ما ہم کہ شد حجاب ما
از پئے خویش شد ہمہ
خویشتن را زرد نجوم
است خوش این چنین قیود
فرق در قادری و قادر نیست
می اطلاق شد قیود

یہ بالکل واضح ہے کہ یہاں مہارت ظاہر سادگی میں ہے۔ اس غزل میں خیال کی جو گہرائی ہے اس کے ساتھ انصاف کوئی شاہ محب اللہ الہ آبادی ہی کر سکتا ہے۔ فارسی میں اس سطح کے ایجاز کے لیے کوئی خسرو ہی چاہیے ہوگا، سوائے اس کے کہ فی الواقع وہ خسرو و شیخ سعدی کی اس کیفیت سے قادری کی طرح سرشار نہیں تھا۔ قادری نے اپنی مکمل غزل کے بیشتر موضوعات کو دوسری غزلوں میں دہرایا ہے اور اس کا نامحدود لب و لہجہ کبھی کبھی بے مزا بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ محض وہم ہے۔ قادری کے اشعار میں انجذاب (سرخوشی) کی بے شمار اور بوقلموں کیفیات کے اظہار کی طاقت ہے۔ اس وقت راہ چلتے مسافر کی باطنی قوت ہی اس کی مددگار ثابت ہوتی ہے جب اس کے قدم ڈگمگانے لگتے ہیں اور آفاقی نور کو اپنے وجود میں جذب کر لینے کی اس کی طاقت کمزور پڑتی نظر آتی ہے۔ جذبے اور کیفیت کی بے شمار صورتیں ایسی ہوتی ہیں جو قاری پر اس طرح اثر انداز ہوتی ہیں جس طرح انجذاب (سرخوشی) حقیقت کے متلاشی میں۔ چشتی صوفیوں کے مطابق یہ حاصل شدہ کیفیات کو گرفت میں رکھنے کی پیش بندی بھی ہو سکتی ہے اور مستقبل میں حاصل ہو سکنے والی کامرانیوں کے راستے کی رکاوٹ بھی۔ آئیے اب ایک ایسی غزل کو دیکھتے ہیں جو تنہائی اور نارسائی کی مخصوص کیفیات کی آئینہ دار ہے:

جان چہ مردہ را تو جانان شو
درد تن دور کن تو درمان شو
من براہت فتادہ ام از پا
دست گیرم شو و خرامان شو
دشمناں دادہ اند آزارم
ز ین سنگ و مضطرب نگہبان شو
مرد سامان خویش گم کردم
مرد سامان و سیر سامان شو
تن و دل من خانہ و تنگی تست
خویش و قوم و در آن جہان شو
ہیچ دانستہ کس تو دانش ما
باعث لطف و فضل و احسان شو
قادری راست حیرت از وحدت
تن او را نگہبان و سلطان شو

یہ لب و لہجہ عراقی اور سنائی جیسے قدیم صوفی شاعروں سے ملتا جلتا ہے۔ فی الحقیقت قادری کے ہاں جذبے کی شدت سنائی سے زیادہ ہے لیکن قادری کا اصل جوہر اس کی رباعیوں میں نظر آتا ہے۔ روایتی طور پر رباعی کا استعمال دانش ورانہ طرز کے صوفی خیالات کے اظہار کے لیے کیا جاتا رہا ہے۔ رباعی کے یہ موضوعات اور کنایات نو افلاطونی طرز کے ہیں جن میں ابن عربی کی گونج سنائی دیتی ہے۔ زیادہ تر صوفیانہ رباعیوں کا مطالعہ عشقیہ شاعری کے طور پر کیا جاتا ہے جس کا سبب یہ ہے کہ ان رباعیوں میں خیال کے مقابلے جذبات کی شدت زیادہ ہوتی ہے۔

قادری نے ایک سو سے زیادہ رباعیاں رقم کی ہیں۔ قادری کی غزلوں کے مقابلے میں جن کی تعداد 216 ہے اور غزلیں بھی مختصر ہیں رباعیوں کی یہ تعداد وافر نظر آتی ہے۔ قادری غزلوں کی طرح اپنی رباعیوں میں بھی ویدانتی اور صوفیانہ موضوعات پیش کرتے ہیں اور غزلوں کی طرح ان رباعیوں میں بھی وہ اسی پیچیدگی اور الفاظ کی بازی گری سے کام لیتے ہیں جو سبک ہندی کی نمایاں خصوصیت ہے۔ ایک اور تکنیک جو اگرچہ سبک ہندی کی ایجاد نہیں لیکن جس میں سبک ہندی کے شاعروں نے مہارت حاصل کی وہ تمثیل ہے۔ یہاں شاعر دعوے کے طور پر ایک بیان دیتا ہے اور پھر اس دعوے کے ثبوت میں ایک مثال پیش کرتا ہے۔ دارا شکوہ اپنی رباعیوں میں اس مہارت کا بھرپور ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔ ان کے دیوان کی یہ 182ویں رباعی ملاحظہ ہو:

خواہی کہ شوی واصل ارباب نظر
از حال بہ حال بایدت کرد گذر
از گفتن توحید موحد نشوی
شیریں نہ شود دہاں ز نام شکر

یہاں یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ قادری نے کتنی صاف ستھری دلیل کے ساتھ اپنے دعوے کو صحیح ثابت کیا ہے۔ لسانیاتی منطق کی رو سے کوئی شے اور اس کے لیے استعمال ہونے والا لفظ ایک نہیں ہوتے:

عارف دل و جان تو حزیں سازد
خارے کند بجاش گلشن سازد
کامل ہمہ را ز عکس حیران آرد
یک شمع ہزار شمع روشن سازد

اب میں ایک آخری رباعی پیش کرتا ہوں جو ویدانتی تصوف اور سبک ہندی کی شاعری کے شاندار امتزاج کا نتیجہ ہے:

بر حق نہ بود چرا تو را ای مشکل
گفتم ہمہ حقند و نہ گفتم باطل
صد موج اگر بود و دریا باشد
در وحدت بحر ہیچ گردد حائل

یہ صحیح ہے کہ قادری کی شاعری بالعموم ان موضوعات سے عاری ہے جو سبک ہندی کی شاعری کی نمایاں خصوصیات میں شامل ہیں مثلاً نارسائی، ترسیل کی ناکامی بلکہ ترسیل کی تنسیخ، استعارے کا شدت سے استعمال جس میں استعارے کو ہی خود حقیقت تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام باتیں قادری کے اس قسم کے ویدانتی تصوف اور وجود کے بارے میں انسانی زبانی حقیقت کا ان کا جو تصور ہے اس کے دوش بدوش نہیں چل سکتیں لیکن ان کی زبان سبک ہندی کے شعرا سے زیادہ قریب ہے۔

قادری کی شاعری میں ایک پہلو ہے، ایک سبک رو آہنگ ہے جسے خسرو روانی کا نام دیتا ہے اور شاعری کی اس خصوصیت کو اس کی قدر اول مانتا ہے۔ دراصل قادری نے اصناف شاعری میں ادھر ادھر ہاتھ پیر چلانے کی زیادہ کوشش نہیں کی۔ انھوں نے کوئی منقبت نہیں لکھی، کوئی نعت نہیں لکھی یہاں تک کہ کوئی حمد بھی نہیں لکھی۔ انھوں نے مثنوی بھی نہیں لکھی۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں بہرحال شعر گوئی دارا شکوہ کا ایک ضمنی شغل تھا لیکن ان الفاظ سے ہمیں اس وہم میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ وہ واقعی شاعر نہیں تھے۔

مصنف کا نوٹ:

مضمون کے انگریزی متن میں تمام ترجمے میرے خود کیے ہوئے ہیں۔ دارا شکوہ کے کلام کا جو text میں نے استعمال کیا ہے وہ دارا شکوہ کے اکسیر اعظم: دیوان دارا شکوہ مرتبہ احمد نبی خاں لاہور یونیورسٹی پنجاب ۱۹۶۹ء سے ہے۔ اس text کی نقل مجھے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر آصف نعیم نے مہیا کی جس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔

شمس الرحمن فاروقی

(سہ ماہی اردو ادب نئی دہلی اپریل تا جون ۲۰۱۳)

○○○

ماضی کی سنہری یادیں

اردو کے مزاحیہ اخبارات

وشواناتھ طاؤس (C-38، سیکٹر 39، نوئیڈا، یوپی 201303)

اردو میں مزاحیہ اخباروں کی داغ بیل منشی سجاد حسین نے ۱۶ جنوری ۱۸۷۷ کو ڈالی جب انھوں نے لکھنؤ سے اخبار 'اودھ پنچ' کا اجرا کیا۔ منشی جی کا جنم ۱۸۵۶ میں کاکوری میں ہوا۔ ایف۔ اے تک تعلیم پائی۔ اس کے بعد فوج میں بھرتی ہو گئے لیکن یہ نوکری ان کے مزاج کے ناموافق تھی، اور ملازمت ترک کر کے میدان صحافت میں قدم رکھا۔ اخبار 'اودھ پنچ' جاری کیا اور ربع صدی تک صحافت کی دنیا میں اپنے نام کا ڈنکا بجایا۔

۱۹۰۱ میں منشی سجاد حسین پر فالج گرا مگر کچھ عرصہ بعد صحت بحال ہو گئی۔ ۱۹۰۳ میں ان پر اس بیماری نے دوسرا حملہ کیا اور ان کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے مگر وہ جیسے تیسے اس اخبار کو چلاتے رہے۔ ۱۹۱۲ میں ان کی طبیعت بری طرح سے بگڑ گئی اور کام کرنا دشوار ہو گیا، لہٰذا اخبار بند ہو گیا، طنز و مزاح کی دنیا سونی ہو گئی۔ تین سال بعد منشی جی کا انتقال ہو گیا۔ حکیم ممتاز علی عثمانی نے ۲۶ اکتوبر ۱۹۱۶ کو یہ اخبار دوبارہ جاری کیا جسے حکیم صاحب کے انتقال کے بعد ان کے فرزند ظہیر حیدر نے ۱۹۳۳ تک جاری رکھا، بالآخر اخبار کی اشاعت بند ہو گئی۔ اخبار 'اودھ پنچ' کے لکھنے والوں میں رتن ناتھ سرشار، اکبر الہ آبادی، جوالا پرشاد برق، نواب سید محمد آزاد، مچھو بیگ ستم ظریف اور تربھون ناتھ ہجر جیسے باکمال مزاح نگار شامل تھے۔ احمد علی شوق اور ظریف دہلوی اس کے مستقل مضمون نگار تھے۔ پہلے یہ چھ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا لیکن مقبولیت میں اضافہ ہونے کے بعد آٹھ صفحات پر چھپنے لگا۔ یہ پرچہ ظرافت کا سرچشمہ تھا اور قارئین اس کے جملوں، لطیفوں اور چٹکیوں سے ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔ اس کی تعداد اشاعت تیرہ ہزار (13000) تک پہنچ گئی تھی۔ مالی اعتبار سے یہ اخبار کامیاب تھا۔ اس کی مقبولیت سے متاثر ہو کر ملک کے کونے کونے سے 'پنچ' شائع ہونے شروع ہو گئے، بنارس پنچ، آگرہ پنچ، دکن پنچ، لاہور پنچ، جالندھر پنچ اور نہ جانے کتنے 'پنچ' جاری ہو گئے لیکن کوئی بھی 'اودھ پنچ' کی ہمسری نہ کر سکا، سب کے سب شعلۂ مستعجل ثابت ہوئے۔

منشی سجاد حسین مشرقی تہذیب و تمدن کے دلدادہ اور ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے۔ وہ خود کانگریسی تھے اور اودھ پنچ مکمل طور پر انڈین نیشنل کانگریس کے نظریات کی حمایت کرتا تھا۔ منشی جی غیر ملکی استبداد اور انگریزوں کے سخت مخالف تھے لہٰذا انھیں سرسید احمد خان کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اودھ پنچ نے علی گڑھ مکتب فکر سے الگ راہ اختیار کی اور صرف قومی خدمت پر توجہ مرکوز رکھی، وہ سرسید کی تحریک کے خلاف ملک میں کانگریس پارٹی کے نظریات کو فروغ دیتا رہا۔ صحافت کے میدان میں اس نے قلم کاروں کو مزاح پیدا کرنے کے آداب سکھائے اور وہ فضا پیدا کی کہ مزاح کاروں کا ایک قافلہ مرتب ہو گیا۔

جنوری ۱۸۸۶ میں لاہور سے مزاحیہ اخبار 'پانچ خان' شروع ہوا۔ اس وقت اس پرچے کے مالک عبدالرحمن اور ایڈیٹر محرم علی چشتی تھے۔ ۱۸۸۹ میں عبدالرحمن نے ہی اس کی ادارت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ جہلم کے 'سراج الاخبار' کے ۳۰ نومبر ۱۸۸۵ کے شمارے میں اخبار 'پانچ خان' کے بارے میں مندرجہ ذیل دلچسپ اشتہار شائع ہوا:

"عام اخبارات میں 'پانچ خان' کا ظہور انیسویں صدی کا کوئی قابل یادگار واقعہ نہیں۔ یہ پولیٹیکل پہلوان جو ظرافت کا لنگوٹہ باندھے مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا اکھاڑے میں چند ہفتہ سے بدلتا آرہا ہے کسی خاص شخص کو اپنا مقابل نہیں بنانا چاہتا بلکہ ہندوستانیوں کے مخالفوں سے کبھی دنگل جمانا اس کا خاص فرض ہوگا۔ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر کھلے بندوں بے دھڑک ان ملعونوں کی گت بنائے گا جو اس کے پیارے وطن یا عزیز ہم وطنوں کی طرف ذرا سی نظر بد بھی کریں گے اور ملک کو دکھاوے گا کہ انگریزی ظرافت کے مذاق کو ایشیائی جامہ پہنا کر ہر دل عزیز بنا دینا کس کو کہتے ہیں۔ اس امر کا تصفیہ ہم اپنے منصف قدر دانوں پر چھوڑیں گے کہ اس پرچہ نے کہاں تک اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی اور جدید ظرافت کا مذاق کہاں تک اپنے ملک میں پھیلایا۔ 'پانچ خان' کا پہلا نمبر شروع جنوری ۱۸۸۶ سے ہفتہ وار نکلے گا، ضخامت چھوٹی تقطیع کے ۸ صفحے کی ہوگی۔"

محمد بخش المعروف بہ مولانا دل نے لاہور سے ۱۸۸۵ میں طنزیہ اور پُر مزاح ہفتہ وار اخبار 'جعفر زٹلی' کا آغاز کیا۔ محرم علی چشتی، مفتی حفظ الاسلام، محمد بخش اور مولوی الہ دین مختلف ایام میں اس کے ایڈیٹر رہے۔ ۱۸۹۳ میں اس کی اشاعت منقطع ہو گئی، ۱۸۹۹ میں دوبارہ چھپنا شروع ہوا۔ جہلم کے 'سراج الاخبار' کی ۲۲ جون ۱۸۸۵ کی اشاعت میں 'جعفر زٹلی' کا جو اشتہار طبع ہوا وہ بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے:

"اودھ پنچ لکھے، دلی پنچ پیدا ہوئے، محشر بپا ہوا، قیامت کے آثار نمودار ہوئے، فتنے خوابیدہ جاگے۔ پنجاب پنچ، کلکتہ پنچ، پارسی پنچ وغیرہ ایرا غیرا سانپ کے سپولیوں کے موافق برساتی مینڈکوں کی طرح اُبل پڑے، بندہ یا عدم سے نکل کر دو پیازہ لاہور نے جنم لیا، پھر آپ جانتے ہیں کہ مولانا منشی عالم فاضل مسٹر پنڈت جعفر زٹلی صاحب بغیر اپنی ٹانگ اڑائے کیوں چپ رہنے والے تھے۔ آپ بھی یکم ماہ جولائی ۱۸۸۵ سے اپنی بڑ ہانکنا شروع کریں گے اور چیدہ چیدہ مذاقیہ فقرے سنائیں گے کہ چٹکتے چٹکتے ہر کسی کے دل میں گل نہ پڑ جائیں تو ہمارا ذمہ۔ مذاق گویا چٹکیاں لیں گی۔ ایک روپیہ بارہ آنے سالانہ پیشگی مع محصول ڈاک کا حساب تمام دو بھی ناظرین، تمہیں بھی قسم ہے جو آدھ آنہ بھیج کر ایک نمبر نہ دیکھو، خدا کی قسم تم ہو جاؤ گے، زیادہ طول محض فضول۔"

ریاض خیرآبادی کی ادارت میں شائع ہونے والے اخبار 'فتنہ عطر فتنہ' کو اردو جرنلزم کے طنز و مزاح میں خاص مقام حاصل ہوا۔ یہ پرچہ اخبار 'اودھ پنچ' کے خوشہ چینوں میں شمار ہوتا تھا۔ اس میں مزاحیہ مضامین کے علاوہ کارٹون اور شاعرانہ مزاح کے وہ نمونے دیکھنے اور پڑھنے کو مل جاتے تھے۔ یہ اخبار جیبی سائز کا تھا جو آسانی سے ایک مقام سے دوسرے مقام تک پڑھنے والوں کی تفریح طبع کے واسطے پہنچ جاتا تھا۔ ریاض خیرآبادی اپنی ذاتی حیثیت میں ایک صلح کل اور محبت پرور شخص تھے لیکن غیر ملکی حکمرانوں کو ناپسند کرتے تھے، اشاروں ہی اشاروں میں بڑی چستی اور شوخی کے ساتھ فرنگیوں پر چوٹ کر جاتے تھے۔ اپنے ہم عصروں کے برعکس جی حضوری کی پالیسی کو ترک کرتے ہوئے انھوں نے ہنستے کھیلتے بے لاگ تنقید کا ایک انوکھا معیار قائم کیا اور تمام پڑھنے والوں کو تو ذکر اپنی آزاد خیالی اور بے باک گوئی کو قائم رکھا۔ وہ لکھتے ہوئے ذاتیات پر بھی نہیں اترے اور نہ کسی پر رکیک حملے کیے بلکہ سیدھے سادے اور عام الفاظ میں اخبار 'فتنہ عطر فتنہ' کو اردو صحافت کا گل سرسبد بنا دیا۔ انھوں نے پوری زندگی صحافت کی خدمت میں گزار دی اور 'فتنہ عطر فتنہ' کے علاوہ 'گل کدۂ ریاض'، 'گلچیں'، 'تار برقی' اخبارات جاری کیے۔

ہفتہ وار 'ملا دو پیازہ' ۱۸۸۵ میں لاہور سے نکلنا شروع ہوا۔ احمد بخش اور الہ دین دونوں اس کے مدیران تھے۔ اس کی ہر تحریر مزاحیہ ہوا کرتی تھی اور کارٹون بھی چھپا کرتے تھے۔ ۱۸۸۵ میں ہی ان لوگوں نے لاہور سے اخبار 'شیخ چلی' شروع کیا۔ اگلے سال یہ سیالکوٹ منتقل ہو گیا۔ اس کا ایڈیٹر غلام قادر کشمیری

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

ہفت روزہ 'پانچ خان' لاہور	ہفت روزہ 'ملا دو پیازہ' لاہور	ہفت روزہ 'شیخ چلی' لاہور	ہفت روزہ 'گورو گھنٹال' لاہور	ہفت روزہ 'شیطان' لاہور
ہفت روزہ 'لاحول' گوجرانوالہ	ہفت روزہ 'رگڑا' گوجرانوالہ	ہفت روزہ 'جعفر زٹلی' لاہور	ہفت روزہ 'عطر فتنہ' لکھنؤ	ہفت روزہ 'اودھ پنچ' لکھنؤ

اردو دنیا

اردو تعلیم کو اسکولوں میں لازمی قرار دیا جائے

جمشید پور (۱۴ دسمبر)۔ ضلع مومن کانفرنس کے ایک نمائندہ وفد نے ضلع صدر نسیم انصاری اور ریاستی لیڈر شاہد انصاری کی قیادت میں وزیر اعلیٰ کے نام ایک عرض داشت کمشنر ابتاب کو پیش کی جس میں مسلم اقلیت کو حکومت کی جانب سے نظر انداز کیے جانے پر گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے ان کی بہتری اور ترقی کے لیے مرکزی اور ریاستی حکومت کے منصوبوں کو بروئے کار لانے کی گزارش کی۔ عرض داشت میں کہا گیا ہے کہ جنگ آزادی اور جھارکھنڈ تحریک میں مسلم اقلیت نے بے حد اہم رول ادا کیا۔ عرض داشت میں اقلیتی تعلیمی اداروں، مدارس اسلامیہ کے اقلیتی کردار کی بحالی کے ساتھ انہیں بعد منظور کرنے کے لیے ٹھوس اقدام کا مطالبہ کرتے ہوئے اردو اساتذہ کی بحالی اور درجہ اول سے میٹرک تک اسکولوں میں اردو تعلیم کو لازمی قرار دینے کا مطالبہ کیا گیا۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

اردو اساتذہ کے ساتھ ناانصافی کے خلاف احتجاج

وزیر اعظم کے 15 نکاتی پروگرام کے تحت 3 و 544 مدارس کو گرانٹ دینے میں حکومت سنجیدہ نہیں

رانچی (۲۱ نومبر)۔ جھارکھنڈ چھاتر سنگھ اور آمیا کے زیر اہتمام مشترکہ طور پر 4401 اساتذہ اور لسانی اقلیتوں کے ساتھ ہو رہے سوتیلے سلوک کے خلاف اور حقائی پالیسی کو نافذ کرنے کی مانگ پر ۲۱ نومبر ۲۰۱۳ کو رانچی یونیورسٹی کیمپس سے ایک ریلی نکالی گئی جو شہید چوک ہوتے ہوئے کانگریس ہیڈ آفس پہنچا اور انصاف کے لیے مظاہرہ کیا۔ یہ مظاہرہ ایک گھنٹے تک جاری رہا۔ جھارکھنڈ چھاتر سنگھ کے صدر ایس علی نے کہا کہ گزشتہ 13 برسوں سے 4401 اردو اساتذہ کی بحالی کا معاملہ زیر التوا ہے۔ ۱۹۹۹ میں پرائمری اور مڈل اسکولوں کے لیے 4401 اردو اساتذہ کے عہدے تخلیق کیے گئے تھے لیکن ۱۵ نومبر ۲۰۱۳ کو اساتذہ بحالی کے لیے نکالے گئے اشتہار میں 4401 اردو اساتذہ کے عہدے کو صرف پرائمری اسکولوں کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے جو درجہ چھ سے آٹھ تک کے اردو سے بی ایڈ پاس امیدواروں کے ساتھ ناانصافی ہے۔ انھوں نے کہا کہ مرکزی حکومت کے ذریعے اقلیتوں کی ترقی کے لیے چلائے جا رہے ایم ایس ڈی پی، آئی ڈی ایم آئی منصوبہ، ملٹی پی کیو ایم منصوبہ، وزیر اعظم 15 نکاتی پروگرام، 544 مدارس کو گرانٹ دینے پر ریاستی حکومت سنجیدہ نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر ان مطالبات پر دس دنوں کے اندر کارروائی نہیں ہوئی تو پوری ریاست میں حکومت اور اس کی اتحادی پارٹیوں کے خلاف مہم چلائی جائے گی۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

معلم اردو سند یافتگان کی تقرری میں نوکر شاہی رخنہ ڈال رہی ہے

وزیر اعلیٰ اور وزیر تعلیم کے نام مکتوب میں اردو ٹیچرس ویلفیئر ایسوسی ایشن کا الزام

سہارنپور (۱۸ نومبر)۔ یوپی سرکار نے جہاں معلم اردو سند یافتگان کی مسلسل جدوجہد کے بعد ان کے دیرینہ مطالبے کو تسلیم کرتے ہوئے ٹی ای ٹی کا امتحان پاس کرنے والے معلم اردو سند یافتگان کے لیے اردو ٹیچر کے طور پر سرکاری ملازمت کے دروازے کھول دیے ہیں وہیں یوپی کی نوکر شاہی اس میں رخنہ ڈال رہی ہے۔ غیر ضروری اور غیر قانونی طور پر تقرری میں اڑچنیں کھڑی کر رہی ہے، یہ الزام اترپردیش ٹیچرس ویلفیئر ایسوسی ایشن کے صوبائی جنرل سکریٹری راؤ عبدالستار نے لگایا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اکھلیش سرکار نے ٹی ای ٹی اور ہائی اسکول پاس یا اس کے مساوی سند کی شرط کے ساتھ ۱۹۹۷ میں معلم اردو کا امتحان پاس کرنے والے افراد کو اردو ٹیچر بنانے کا اعلان کیا ہے لیکن نوکر شاہی طرح طرح کی شرطیں عائد کر رہی ہے۔ ۱۹۹۷ میں پاس معلم اردو کی مارک شیٹ کے بجائے ۱۹۹۶ کے تحت مادی قید لگانے کے علاوہ جامعہ اردو علی گڑھ کی ادیب کی سند کو ہائی اسکول کی سند کے مساوی تسلیم نہیں کیا جا رہا ہے جس کی وجہ سے معلم اردو سند یافتگان کو بحیثیت اردو ٹیچر سرکاری ملازمت سے محروم رکھا جا رہا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ یوپی میں فی الحال 4280 تقرریاں کی جانی ہیں لیکن نوکر شاہی اس میں آڑے آ رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اترپردیش ٹیچرس ایسوسی ایشن کی طرف سے ایک مکتوب وزیر اعلیٰ اکھلیش یادو کے نام ارسال کیا گیا ہے اور اس کی نقول وزیر تعلیم اور وزارت تعلیم کے سکریٹری کو بھی ارسال کی گئی ہیں جس میں معلم اردو سند یافتگان کی تقرریوں میں آ رہی رکاوٹ کو دور کر جلد از جلد اردو اساتذہ کی بحالی کو یقینی بنانے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

راؤ عبدالستار نے اس بات پر بھی تشویش ظاہر کی کہ اردو جن اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے وہاں اکثر اسکولوں میں اردو کی نصابی کتابیں ابھی تک مہیا نہیں کرائی گئی ہیں۔ انھوں نے ضلع سہارنپور کی مثال دی اور کہا کہ 381 سے زائد ایسے اسکول ہیں جہاں ابھی تک اردو کے طلبہ کو اردو کی کتابیں سرکار نے دستیاب نہیں کرائی ہیں جس سے طلبہ کا تعلیمی نقصان ہو رہا ہے۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

پوری ریاست میں اردو مترجمین کی تقرری کے لیے مہم چلائی جائے

لکھنؤ (۳۰ اکتوبر)۔ عام انتخاب کے مدنظر تیز ہوتی سیاسی سرگرمی کے درمیان سماج وادی حکومت نے اردو مترجمین کی بھرتی کے لیے مہم چلا کر اپنے انتخابی وعدے پورے کرنے کی سمت ایک قدم اور بڑھا دیا ہے۔ دراصل حکومت اتر پردیش چاہتی ہے کہ لوک سبھا انتخابات سے قبل تمام محکموں میں اردو مترجمین کے خالی عہدوں پر تقرری کا عمل شروع کر دیا جائے۔ وزیر اعلیٰ اکھلیش یادو کی ہدایت پر تقرری اور محکمہ بہبود پنشن کے پرنسپل سکریٹری راجیو کمار نے اتنی میں منتقلہ اور ضلع سطح سے لے کر بلاک سطح تک خالی عہدوں کو پُر کرنے کے ساتھ ساتھ اردو مترجمین کی سروس سے متعلق بھی تقاضوں کو دور کرنے کی ہدایت دی ہیں۔ (آبشار، لکھنؤ)

اسد رضا کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ برائے ادب اطفال

گوا (۱۸ نومبر)۔ اردو کے صاحب طرز ادیب، شاعر، صحافی اور روزنامہ راشٹریہ سہارا سے وابستہ سینئر صحافی جناب اسد رضا کو ساہتیہ اکادمی کی جانب سے ایوارڈ برائے ادب اطفال پیش کیا گیا۔ گوا کی راجدھانی پنجی کے کلا اکیڈمی آڈیٹوریم میں منعقدہ ایک پروقار تقریب میں دیگر 24 سرکاری منظور شدہ زبانوں کے ادیبوں کو بھی اس موقع پر ایوارڈ پیش کیے گئے۔ ساہتیہ اکادمی کے چیئرمین پروفیسر وشوناتھ پرساد تیواری اور پروفیسر منوج کے ہاتھوں یہ ایوارڈ پیش کیے گئے۔ اس موقع پر ساہتیہ اکادمی کی اہم شخصیات کے علاوہ ریاست کے مختلف حصوں سے آئے لوگ بھی بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ اسد رضا کو ایوارڈ میں 50 ہزار روپے کا چیک اور ایک مومنٹو بھی پیش کیا گیا۔ ایوارڈ حاصل کرنے کے بعد اسد رضا نے ادب اطفال کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ بچے ہی کسی قوم و ملک کا مستقبل ہوتے ہیں اور ہمارے ادیبوں اور شاعروں کو اس سمت میں خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

ہر یونیورسٹی میں مولانا آزاد چیئر قائم کی جائے

علی گڑھ (۱۳ نومبر)۔ ہندوستان کے اولین وزیر تعلیم اور مجاہد آزادی مولانا ابوالکلام آزاد کی یاد میں منعقد بیداری مہم کمیٹی (ایم پی ایم سی) علی گڑھ کے زیر اہتمام "مولانا ابوالکلام آزاد کی حیات و خدمات موجودہ تناظر میں" موضوع پر مرزا منزل کمپلیکس میں واقع میڈیا سینٹر پر ایک جلسے کا انعقاد عمل میں آیا جس کی صدارت کرتے ہوئے ایم پی ایم سی کے صدر پروفیسر رضا اللہ خاں نے کہا کہ مولانا کی تمام زندگی ملک و قوم کی خدمت کے لیے وقف تھی اور وہ جتنے عظیم مذہبی رہنما تھے اتنے ہی عظیم سیاست داں بھی تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہماری سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ ہم مولانا آزاد کی اقدار کو فراموش کر بیٹھے ہیں اور جو قومیں اپنے بزرگوں کو فراموش کر دیتی ہیں، زندگی کے ہر میدان میں پس ماندگی کا شکار ہوتی ہیں۔ ایم پی ایم سی کے سکریٹری جنرل تسلیم محمد نے کہا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے نام پر متعدد پروگرام وضع کیے گئے ہیں مگر ان پروگراموں کو صحیح طور پر نہیں چلایا جا رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ملک کی آزادی کے بعد سے اب تک مولانا آزاد کو ہندوستان میں وہ مقام نہیں حاصل ہو سکا جس کے وہ حق دار تھے۔ تسلیم محمد نے کہا کہ مرکزی حکومت کو مولانا آزاد کی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے عوامی سطح پر مہم چلانی ہوگی جس کے تحت جاری کرنے جیسے کاموں سے آزاد شخصیت کو فروغ حاصل نہیں ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ ملک کی ہر یونیورسٹی میں مولانا آزاد چیئر قائم کی جائے اور ہر اسکول میں پرائمری سطح سے مولانا ابوالکلام آزاد کی حیات و خدمات کی تعلیم دی جائے تاکہ آنے والی نسلیں ملک کے اس عظیم رہنما سے واقف ہو سکیں۔ ممتاز سائنس داں اور اے ایم یو کورٹ کے رکن پروفیسر ہمایوں مراد نے کہا کہ مولانا آزاد نے ملک کی آزادی کے لیے جو قربانیاں پیش کیں ان کی مثال ملک کی تاریخ میں ملنا ممکن نہیں۔ اس موقع پر ڈاکٹر غلام فرید صابری، ڈاکٹر روحت رام شرما، ڈاکٹر فاطمہ زہرہ، سید علی سردار جعفری، دلشاد قریشی اور محمد آفتاب خان وغیرہ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ (آگ، لکھنؤ)

اردو چینل بند کر دیے جانے پر اردو شائقین میں برہمی

بجنور (۱۸ نومبر)۔ گزشتہ تقریباً ایک ماہ سے ٹی وی پر دکھائے جانے والے تمام اردو چینل بند کر دیے جانے پر اردو شائقین میں برہمی پائی جا رہی ہے۔ واضح رہے کہ اردو چینل، کیبل کنکشن ہولڈر کو سیٹ اپ باکس لگانے کے لیے مجبور کرنے کی خاطر بند کر دیے گئے ہیں۔ کیبل آپریٹرس کا کہنا ہے کہ ایسا کرنے سے ناظرین اپنے پسندیدہ چینل دیکھنے کے لیے سیٹ اپ باکس لگانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اس پر شہر کے اردو داں طبقے کا کہنا ہے کہ ٹی وی پر سب سے زیادہ ٹی آر پی مختلف نیوز چینلوں اور خانگی سیریلوں کی ہے۔ اگر کیبل آپریٹرس ناظرین کو سیٹ اپ باکس لگانے کو مجبور کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے انھیں نیوز اور سیریل دکھانے والے چینلوں کو بند کرنا چاہیے تھا لیکن ایسا نہ کر کے انھوں نے چن چن کر صرف اردو چینل ہی بند کیے ہیں، یہاں تک کہ سہارا کے اردو سروس کو بھی بند کر دیا ہے۔ (انقلاب، دہلی)

گرامی نامے

ادارے کا مراسلہ نگاروں سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے

'انتخابات کا جمہوری عمل اور اردو کے حقوق کی خاطر اہل قلم کے تحریک کا مسئلہ' کے بارے میں

مکرمی! 'ہماری زبان' کے ۲۴ تا ۳۰ نومبر ۲۰۱۳ء میں آپ کا اداریہ 'انتخابات کا جمہوری عمل اور اردو کے حقوق کی خاطر اہل قلم کے تحریک کا مسئلہ' نہ صرف اہمیت کا حامل ہے بلکہ انتخابات جیسے اہم جمہوری عمل کا استعمال اردو کے حق میں کرنے کا پیغام اردو عوام، اردو کے اہل قلم، اردو کے دانشوروں اور اردو کی تنظیموں کو دیتا ہے۔

میں آپ کے اس خیال سے متفق ہوں کہ اردو آبادی معاشی طور پر اتنی پس ماندہ ہے کہ وہ اپنے وسائل سے اردو ذریعہ تعلیم کے اسکول نہیں قائم کر سکتی ہے اس لیے حکومت کو مجبور کرنا چاہیے کہ وہ ایسے اسکول کھولے۔ ساتھ ہی دیگر سرکاری اسکولوں میں ایسے بچوں کے لیے جن کی مادری زبان اردو ہے پہلی اور لازمی زبان کے طور پر اردو پڑھانے کے انتظامات کیے جائیں۔ یہ بنیادی کام اردو والوں کو ضرور کرنا چاہیے۔ لیکن ہمارا تجربہ ہے کہ حکومت اور سرکاری محکمہ اردو کے بارے میں انتہائی غیر ذمہ دار اور متعصب ہے، اس لیے جہاں ممکن ہو یعنی وسائل ہوں وہاں اردو والوں کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہیے۔ وہ اپنے اسکول اور کالج خود کھولنے چاہئیں، جن کا تعلیمی معیار اعلا ہو اور نصاب سرکاری تعلیمی اداروں جیسا۔ حکومت کے دست نگر رہنے کا خمیازہ اردو والے پچھلے 65 سال سے بھگت رہے ہیں، اس لیے ہمارے سامنے دوسرا راستہ بھی ہونا چاہیے۔ حالاں کہ ہر جگہ یہ ممکن نہیں ہوگا اور نہیں سرکاری اسکولوں اور سرکاری امداد حاصل کرنے والے اسکولوں میں ہی اردو کے تعلیمی انتظامات کرانے کی کوشش اور جدوجہد کرنی ہوگی۔

آپ نے صحیح کہا ہے کہ اردو کے تمام ادارے مراعات یافتہ ہیں، حکومت کی گرفت میں آنے کے باعث تقریباً ہر اہل قلم ان سے بلاواسطہ یا بالواسطہ فیض یاب ہو کر یہ سمجھنے لگا ہے کہ اب اگر اس نے اردو کے حق میں آواز اٹھائی تو وہ حکومت کے فیض سے محروم ہو جائے گا۔ اسی صورت حال کا عکس یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم اردو طلبہ میں بھی نظر آنے لگا ہے اور وہ اپنے حال اور روشن مستقبل کے خیالی تصور میں ایسے گم ہو گئے ہیں کہ اردو کے حق میں آواز اٹھانے سے بھی گریز کرتے ہیں۔ یہ صورت نہایت افسوس ناک ہے۔ لیکن اس ماحول میں بھی اردو کے حق میں آواز بلند کرنے والی ایک ادبی تنظیم جن وادی لیکھک سنگھ (انجمن جمہوریت پسند مصنفین) ہے، جس میں نوے فیصدی ہندی کے ادیب ہیں لیکن جو اردو کے حق میں مسلسل آواز بلند کرتی رہی ہے۔ یہ تنظیم اردو کی حمایت اردو والوں کو خوش کرنے کے لیے نہیں کرتی ہے بلکہ اردو سے آگہی اور جمہوری حقوق کی حمایت کی خاطر کرتی ہے۔

جن وادی لیکھک سنگھ (انجمن جمہوریت پسند مصنفین) نے اردو کو ہندی کی ایک شیلی قرار دینے اور اس کو ناگری رسم الخط میں ضم کرنے کے خیال کی سخت مذمت کی ہے۔ وہ یہ تسلیم کرتی ہے کہ آزادی کے بعد اردو سرکار کے تعصب کا شکار ہوئی ہے اور یہ مطالبہ بھی کرتی رہی ہے کہ جہاں اردو بولنے والوں کی دس فیصد آبادی ہو وہاں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔ مختصر یہ ہے کہ انجمن جمہوریت پسند مصنفین اردو کے تحفظ اور بقا کی تحریک کو جمہوریت اور جمہوری حقوق کے تحفظ کی تحریک کا ایک لازمی حصہ تسلیم کرتی ہے۔

اردو زبان کے بارے میں جن وادی لیکھک سنگھ (انجمن جمہوریت پسند مصنفین) کے اس واضح اور دوٹوک اسٹینڈ کی وجہ سے ہی اردو کے نامور ادیب اور دانشور ڈاکٹر محمد حسن اس تنظیم سے وابستہ رہے ہیں۔ واضح ہو کہ جن وادی لیکھک سنگھ ہندی اور اردو کے ادیبوں کی ایک کل ہند تنظیم ہے لیکن اس میں ہندی کے ادیبوں کی غالب اکثریت ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کے ادیب بھی بڑی تعداد میں جن وادی لیکھک کا ساتھ دیں اور ہندی کے ادیبوں کے ساتھ مل کر اردو کے آگہی اور جمہوری حقوق کے لیے آواز بلند کریں۔ اس عمل سے اردو کے محاذ کو تقویت حاصل ہوگی۔

ایک مدت بعد 'ہماری زبان' کا اداریہ اتنا بے باک دیکھ کر تعجب بھی ہوا اور اچھا بھی لگا، جو مصلحت آمیزی سے بلند ہو کر قلم بند کیا گیا ہے اور جو آپ کی صاف گوئی کی دلیل ہے۔ آپ نے خاطیوں کے چہرے بے نقاب ہوتے ہوئے سامنے سے اہل اردو کو خبردار کرنے اور وسیع تر جمہوری عمل میں شامل ہو کر غیر جمہوری جیسے فسطائی کردار کو برسر اقتدار آنے سے روکنے کی ضرورت پر زور دیا ہے جو قابل قدر اور وقت کا اہم تقاضا بھی ہے۔

میری رائے میں ملک کی جمہوری تحریک کا حصہ بننے کے لیے انجمن ترقی اردو کا کردار بھی عوامی اور جمہوری ہونا ضروری ہے۔ اسے سرکاری کالجوں اور یونیورسٹیوں کے پروفیسروں کے دائرے تک ہی محدود نہیں رکھنا چاہیے کیوں کہ یہ لوگ اردو کی تحریک کی قیادت نہیں کر سکتے، ان کی اپنی حدود ہیں اس سے آگے نہیں جا سکتے۔ جب تک انجمن میں ہر سطح پر اردو عوام بڑھ چڑھ کر حصہ نہیں لیں گے، اس وقت تک انجمن میں نہ تو نئی لیڈر شپ پیدا ہوگی اور نہ سرکار ہی اردو کے جائز حقوق کو تسلیم کرے گی۔ جمہوریت میں چند اعلا تعلیم یافتہ افراد کی اہمیت کے حامل نہیں ہوتے بلکہ فیصلہ کن طاقت عوام ہی ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی انجمن ترقی اردو کو چاہیے کہ وہ جن وادی لیکھک سنگھ (انجمن جمہوریت پسند مصنفین) جیسی تنظیموں کے ساتھ تعاون کرے جو اردو کے جمہوری حقوق کی حمایت میں سرگرداں ہیں تاکہ جدوجہد کے لیے ایک وسیع پلیٹ فارم تیار ہو سکے۔

وقار صدیقی
103 گاردن ہومز، فیز III
انکا پوری، گوالیار (ایم پی)

اردو بچاؤ تحریک نے 'رشتہ جوڑو اردو سے' مہم شروع کی

فیض آباد (۱۲ نومبر)۔ اردو بچاؤ تحریک نے 'رشتہ جوڑو اردو سے' کے نام سے مہم شروع کی۔ یہ مہم چوک سے رکاب گنج تک پہنچی جس میں لوگوں سے اپیل کی گئی کہ اپنے روزمرہ کے کام کاج میں زیادہ سے زیادہ اردو کا استعمال کریں۔ 'رشتہ جوڑو اردو سے' مہم کی قیادت قومی امن کمیٹی کے صدر اوصاف احمد علی نے کی۔ اردو بچاؤ تحریک کے جنرل سکریٹری ارشاد ربانی نے بتایا کہ مہم کا عوام نے گرم جوشی سے استقبال کیا۔ میڈیا انچارج اشتیاق خاں نے بتایا کہ اس مہم کے تحت جگہ جگہ جلسے و جلوس کا انعقاد کیا جائے گا تاکہ لوگوں میں اردو کے لیے بیداری پیدا ہو۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

اک دیا اور بجھا

نئی دہلی۔ اردو کے مشہور و ممتاز صحافی، شاعر، افسانہ نویس اور ناول نگار ظفر عدیم کا حرکت قلب بند ہونے سے ۱۶ نومبر ۲۰۱۳ء کو ذاکر نگر (جامعہ نگر) میں واقع ان کے مکان پر انتقال ہو گیا۔ وہ ۷۳ برس کے تھے۔ مرحوم کے پس ماندگان میں بیوی اور چار بچے ہیں۔ ان کی تدفین بعد نماز عشاء بٹلہ ہاؤس قبرستان میں عمل میں آئی۔ ظفر عدیم کا تعلق بہار کے مظفر پور شہر کے ایک علمی خانوادے سے تھا اور وہ وہاں کی ادبی محفلوں کی جان بھی تھے۔ کئی سرکاری اور غیر سرکاری اداروں نے انھیں ایوارڈ سے بھی نوازا تھا۔ ظفر عدیم نے تقریباً چالیس سال تک اردو ادب اور صحافت کی خدمت کی۔ نو عمری میں انھوں نے صحافت کو رخ کیا تھا لیکن اس کے بعد دہلی آ گئے تھے۔ یہاں انھوں نے ایک صحافی کی حیثیت سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا اور دہلی کے مختلف اخبار و جرائد سے وابستہ رہ کر انھوں نے خدمت انجام دی۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

گورنمنٹ اردو میڈیم اسکول گدوال کو بند کرنے کی سازش

محبوب نگر، آندھرا پردیش (۱۶ نومبر)۔ گورنمنٹ پرائمری اسکول اردو میڈیم گدوال کو بند کرنے کی سازش کے خلاف عتیق احمد (صدر مسلم مائناریٹی ویلفیئر سوسائٹی گدوال) نے ایڈیشنل جوائنٹ کلکٹر رجیہ رام سے نمائندگی کی۔ عتیق احمد نے ایڈیشنل جوائنٹ کلکٹر کو بتایا کہ گورنمنٹ پرائمری اسکول اردو میڈیم گدوال کو سال ۲۰۱۰ میں سروشکشا ابھیان کے زیر اہتمام دو ودیا والینٹرس کے ساتھ شروع کیا گیا تھا۔ اس سال ۱۱۵ طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ ودیا والینٹرس کو تنخواہوں کی عدم اجرائی اور اسکول کے کرایے کی عدم ادائیگی کے باعث طلبہ کی تعلیم متاثر ہو رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسکول میں اساتذہ کا تقرر کیا جانا چاہیے اور تعلیمی سرگرمیوں کی بحالی عمل میں لائی جانی چاہیے۔ ایڈیشنل جوائنٹ کلکٹر نے تمام باتیں بغور سماعت کیں اور متعلقہ عہدیداروں سے بات کرنے اور اسکول کو برخاست نہ کرنے کا یقین دلایا۔

(اعتماد، حیدرآباد)

○

نئی دہلی۔ اردو کے مشہور صحافی، 'انقلاب' کے کالم نگار، دور درشن اور آل انڈیا ریڈیو کے سابق نیوز ریڈر محمد نور بخش کا طویل علالت کے بعد شاہدرہ کے ایک اسپتال میں ۹ نومبر ۲۰۱۳ء کو انتقال ہو گیا۔ وہ ۱۱ برس کے تھے۔ نور بخش نے اپنی زندگی کا آغاز آل انڈیا ریڈیو میں ایک اناؤنسر کی حیثیت سے کیا اور جب ۱۹۷۷ء میں لکھنؤ دور درشن شروع ہوا تو وہ اس سے وابستہ ہو گئے اور اناؤنسمنٹ کرنے کے ساتھ ساتھ نیوز بھی پڑھنے لگے۔ تو سے کی دہائی میں انھوں نے دور درشن سے رضاکارانہ سبک دوشی حاصل کی اور شاہدرہ میں قیام پذیر ہو گئے جہاں وہ ایف ایم ریڈیو اور الیکٹرانک میڈیا سے وابستہ رہے۔ روزنامہ 'انقلاب' کے نارتھ ایڈیشن کا سلسلہ جب شروع ہوا تب ہی سے نور بخش نے ہفتہ وار کالم لکھنا شروع کر دیا جو ان کے بیمار ہونے سے پہلے تک جاری رہا۔ مرحوم کے پس ماندگان میں اہلیہ کے علاوہ دو بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

○

مرادآباد۔ سینئر صحافی اور ماہنامہ 'شمسی آواز' کے مدیر اعلا اور سماجی خدمت گار جناب عبدالحمید شمسی کا ۱۴ نومبر ۲۰۱۳ء کو انتقال ہو گیا۔ وہ 63 برس کے تھے۔ مرحوم کے پس ماندگان میں اہلیہ کے علاوہ چار بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔ وہ طویل عرصے سے گٹھیے کے مرض میں مبتلا تھے۔ رات تقریباً دو بجے انھوں نے اپنی زندگی کی آخری سانس لی۔ انھیں رام پور روڈ پر واقع ان کے آبائی قبرستان میں بعد نماز ظہر سپرد خاک کیا گیا۔ عبدالحمید شمسی ۵ اگست ۱۹۵۰ء کو مرادآباد کے ایک متوسط خاندان میں پیدا ہوئے۔ اردو کتابیں پڑھنا اور اردو اخبارات کا مطالعہ کرنا ان کے معمول میں شامل تھا۔ اس طرح بے شمار کتابیں پڑھنے کے ذوق میں ہی انھیں رسالوں اور اخبارات میں مضمون بھیجنے کا شوق بھی پیدا ہو گیا۔ انھوں نے 100 سے زیادہ کہانیاں لکھیں۔ مرحوم کے جنازے میں کثیر تعداد میں سیاسی، سماجی اور اردو ادب سے وابستہ شخصیتیں موجود تھیں۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : شمس و اثر
مصنف : ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
اشاعت : ۲۰۱۳ء
ضخامت : ۲۰۸ صفحات
قیمت : ۳۰۰ روپے
ملنے کا پتا : دارالمصنفین شبلی اکیڈمی شبلی روڈ، اعظم گڑھ۔ ۲۷۶۰۰۱
تبصرہ نگار : دیپک بدکی
deepak.budki@gmail.com

ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی مشہور ادارے دارالمصنفین اور دبستان شبلی سے وابستہ ہیں۔ ۲۵ سالہ ادبی سفر میں انھوں نے کثرت سے مقالے تحریر کیے ہیں جن میں زیادہ تر علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت اور فکر و فن کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ زیر نظر کتاب ان کے علمی، تنقیدی اور سوانحی مضامین کا چوتھا مجموعہ ہے جس میں علامہ شبلی اور ان کے پرستاروں کے فکر و فن، نظریے اور ادبی خدمات کا جائزہ بڑی دقیقہ شناسی سے لیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اس دائرے سے باہر چند ادبا و شعرا اور اعظم گڑھ کے ادبی منظر نامے پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

پہلے مضمون 'علامہ شبلی کا علمی و فکری سرمایہ' میں علامہ کے تخلیقی و تنقیدی شعور پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ بہ قول مصنف شبلی نے اردو، فارسی اور عربی میں ۴۱ کتابیں قلم بند کی ہیں جن میں شاعری، علم الکلام، اشاعت اسلام، سیرت نگاری، تاریخ، تنقید، سوانح، سیاسیات اور مکتوبات شامل ہیں۔ انھوں نے بہ طور صحافی بھی کام کیا اور انجمن ترقی اردو کی بنیاد ڈالی۔ حالاں کہ شبلی شاعری میں وہ کمال نہیں دکھا سکے جو انھوں نے نثر میں حاصل کر لیا تاہم انھوں نے مذہبی، اخلاقی، تاریخی اور سیاسی نظموں کو آغاز کیا۔ ان کے اسلوب کی خصوصیات قوت، جوش، تکرار، ایجاز و اختصار، حسن ترتیب، شعریت اور شگفتگی ہیں۔ انتقادیات میں 'موازنہ انیس و دبیر' اور 'شعر العجم' کی پانچ جلدیں ان کو صف اول کے نقادوں میں جگہ دیتی ہے۔

دیباچے میں ڈاکٹر محمد الیاس لکھتے ہیں کہ "شبلی کو ایک زمانہ میں منکر غالب قرار دیا گیا تھا لیکن یہ خلاف واقعہ ہے۔" اس کی وضاحت انھوں نے مضمون 'غالب اور شبلی' میں کی ہے جس میں غالب اور شبلی کی شاعری، نثر اور مکتوبات کا موازنہ کیا گیا ہے۔ دونوں فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے۔ شبلی غالب کی شاعری اور مکتوب نگاری کے مداح تھے۔ شبلی کے یہاں فلسفیانہ رنگ غالب ہے۔ غالب مورخ بھی تھے مگر شبلی تاریخ کو نئی وسعتیں عطا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ بہ قول مصنف "شبلی محض ادیب و شاعر اور انشا پرداز نہ تھے بلکہ محقق، مصنف، مورخ اور نقاد بھی تھے۔" تیسرے مضمون 'علامہ شبلی کی ملی و دردمندی' میں شبلی کی ان نظموں پر روشنی ڈالی گئی ہے جن میں ملت کی بیداری، اخلاقیات اور حب الوطنی پر زور دیا گیا ہے مگر اس کے باوجود شبلی دو قومی نظریے کے خلاف تھے اور ہندو مسلم اتحاد کے خواہاں تھے۔ جہاں تک اقبال اور شبلی کا سوال ہے، دونوں عمر فضل کے میر تو ہیں۔ تھے۔ دونوں میں نظریاتی اور جذباتی ہم آہنگی تھی اور دونوں مسلمانوں کی بہبود اور اتحاد کے داعی تھے۔ "اقبال کا نظریہ سیاست بھی شبلی کے فکر و نظر کا پرتو ہے۔" اس بات کی نشاندہی 'علامہ اقبال اور دبستان شبلی' میں کی گئی ہے۔ بہ قول ڈاکٹر الیاس 'شبلی نے اقبال کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف ایک مجمع خواص میں کیا تھا'۔ اس کے علاوہ مضمون میں اقبال کا دارالمصنفین، سید سلیمان ندوی، عبدالسلام ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمن، یحیٰی اعظمی اور ماہنامہ 'معارف' سے تعلق کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

شبلی کے شاگردوں کی ادبی خدمات کا بیان کئی مضامین میں ملتا ہے جیسے 'اقبال سہیل اور غالب شناسی' اور 'مولانا ضیاء الدین اصلاحی۔ بہ طور شبلی شناس'۔ مصنف نے چند ایسے ادیبوں اور مفکروں پر بھی اپنے مضامین قلم بند کیے ہیں جنھوں نے عمر بھر گیسوئے اردو کو سنوارنے کی کوشش کی۔ ملاحظہ کیجیے مضامین 'ڈاکٹر ذاکر حسین اور اردو'، 'فخر الدین علی احمد۔ ایک عہد ساز شخصیت'، 'انشور واحدی'، 'ڈاکٹر احمد لاری کی یاد میں'، 'ضیاء الرحمن اعظمی'، 'بدر عالم خاں اعظمی'۔ مذکورہ شخصیات میں سے اکثر اعظم گڑھ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ 'اعظم گڑھ کا شعری منظر نامہ' کے عنوان سے بھی مضمون شامل اشاعت ہے۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے دارالمصنفین کے ماہنامہ 'معارف' کی ادبی خدمات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ کتاب کے آخر میں ڈاکٹر صاحب نے 'اختراعی ادب: چند معروضات' کے تحت اپنے تاثرات بھی قلمبند کیے ہیں۔ یہاں پر چند اشعار جو کتاب میں پیش کیے گئے ہیں نقل کرتا ہوں کہ انھوں نے مجھے کافی متاثر کیا:

سورج کو اندھیروں سے نکلنے نہیں دیتے
جو لوگ سیہ رات کو ڈھلنے نہیں دیتے
کشتی میں جکڑ رکھا ہے ہر موج رواں کو
جناب سمندر کو اچھلنے نہیں دیتے
(بدر عالم)

(موجودہ دور کے سیاسی تناظر کو بڑی خوبی سے منعکس کیا ہے)

بتاؤں کیا تجھے حاصل فریب زندگانی کا
جو پایا تھا وہ کھو آئے، جو بیچا تھا وہ بار آئے
(انشور واحدی)

جو دلوں پہ صدائیں آ رہی ہیں آبشاروں سے
اگر دل سے کی دامن ہوگی تو بچوں کے بال و پر پیدا
(اقبال سہیل)

دل محروں سے ہر نقش تصور مٹ جاتا ہے
مگر اک یاد ان کی جاودانی ہوتی جاتی ہے
(یحیٰی اعظمی)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مذکورہ کتاب گنجینۂ ادب و ثقافت ہے۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے نہ صرف شبلی اور دارالمصنفین کی جزوی شخصیات پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے بلکہ اپنی جائے پیدائش کا کچھ حد تک قرض چکانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مکتب شبلی کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب بہت کارآمد ہے اور اس کی حوالہ جاتی افادیت مسلم ہے۔

☆☆☆

نام کتاب : سواد حرف
مصنف : مختار شمیم
ضخامت : ۲۸۳ صفحات
قیمت : ۳۵۰ روپے
تقسیم کار : ڈاکٹر سمیع بسرونجی، سہ ماہی انتساب، سرونج (ایم۔ پی)
تبصرہ نگار : ڈاکٹر سید معصوم رضا مشرقی
razakidak@gmail.com

اردو ادب میں شاعری کے بعد منظر عام پر آنے والی کتابوں میں سب سے زیادہ اشاعت تنقیدی مضامین کے مجموعوں کی ہوتی ہے۔ زیر نظر کتاب 'سواد حرف' بھی مختار شمیم کے تنقیدی مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے، جس میں حرف اول کے علاوہ 35 تنقیدی مضامین شامل ہیں، جس میں داستان غدر اور ۱۸۵۷ کے اردو ادب سے متعلق دو مضامین شامل ہیں۔ کلام اقبال، مطالعہ اقبال اور اقبال کے فکری زاویے سے متعلق تین مضامین شامل ہیں، اس کے علاوہ ڈاکٹر سید جعفر کی تنقید نگاری، حکیم سید ظل الرحمن: حیات و خدمات ایک جائزہ اور ڈاکٹر سید حنیف نقوی سے متعلق تین مضامین شامل ہیں۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی شخصیت کے چند پہلو سے متعلق ایک منظوم بیان، کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے، دونوں مضامین بے حد اہم ہیں۔ اس کے علاوہ اختر شیرانی اور ہم، مضطر خیرآبادی اور ان کا ادبی گھرانہ، جاں نثار اختر: حیات و فن اور ڈاکٹر کشور سلطان، نواب مرزا داغ کی دقیق الفاظ، نذیر بنارسی کی شاعرانہ اقدار، ایک دلنواز شخصیت، شعری بھوپالی، شہر سخن کا امیر شاہد میر، آثار سانچی، ارشد قدوائی، جیسے لوگ اچھے مرزا احمد، جیب میں پتھر، کوثر صدیقی، ظفر صہبائی، فضل تابش، مدد افسن وغیرہ کی شاعری کے حوالے سے بلاشبہ معیاری و تحقیقی نگارشات ہیں جو مختار شمیم کے عمیق مطالعے کی بہترین غماز ہیں۔ اس کے علاوہ نثر کے حوالے سے بھی ان کی جو تحریر اس کتاب میں شامل ہے ان میں اختر سعید خاں کے نثری مضامین کا مجموعہ 'ضربیں' اور مظفر حنفی کا 'مضامین تازہ' اور دیپک بدکی کا ایک افسانوی مجموعہ کا کرب' بھی مصنف کی تنقیدی تصورات پیش کی ہیں۔

'اردو میں قصیدے کی شناخت کا مسئلہ' ڈاکٹر ابو محمد سحر اردو قصیدے کے معتبر ناقد اور محقق 'میں قصیدے کے فن پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ فن رباعی سے متعلق 'رباعی کا فن اور ابراہیم اشک' (الف کے تذکرے نمونوں کی روشنی میں) بھی رباعی کے فن کے حوالے سے ایک بہترین اضافہ ہے۔

مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے کہ مختار شمیم کے زور بیان اور تحقیقی و تنقیدی حیثیت نے ان تمام مضامین میں تنقیدی تخلیقیت کا سامان فراہم کر دیا ہے۔ ادب کے مختلف موضوعات پر جا بجا بکھرے مضامین کو یکجا کر کے تنقیدی مجموعے کی شکل میں شائع کر کے مختار شمیم صاحب نے بلاشبہ اردو ادب میں ایک اضافہ کیا ہے جس کی خاطر خواہ پذیرائی ہونی چاہیے۔ ○○

بقیہ: اردو کے مزاحیہ اخبارات

صفحہ ۳ سے آگے

تھا جس کی تنخواہ پندرہ روپے ماہانہ تھی۔ یہ زیادہ دنوں تک نہ چل سکا۔ ملتان سے جس راج ماتھیا نے ہفتہ وار 'ہنٹر' جاری کیا۔ یہ ۱۹۳۳ سے ۱۹۳۵ تک چھپتا رہا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے ایڈیٹر ہاتھ میں ہنٹر لے کر چلا کرتے تھے تا کہ اخبار کی پبلسٹی بھی ہوتی رہے۔ لوگ کہا کرتے تھے وہ جا رہا ہے ہنٹر والا۔ انھی دنوں مشہور فلم ایکٹرس نادیا کی فلم 'ہنٹر والی' مارکیٹ میں ریلیز ہوئی تو لوگ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے "کیا ہنٹر والی ماتھیا صاحب کی بیوی ہے؟" گوجرانوالہ سے ۱۹۲۳ میں میر بسمل کی ادارت میں 'اچھوتی' جاری ہوا۔ یہ پرچہ لاہور کے اخبار 'شیطان' کے مقابلے میں نکالا گیا تھا جس کا ایڈیٹر ایک ہندو اخبار نویس تھا۔ وہ اور میر بسمل گہرے دوست تھے۔ دونوں کا اندر کھاتے معاہدہ تھا۔ جب ایک اخبار کی اشاعت گرنے لگتی تھی تو دوسرا اخبار اس کے خلاف زور و شور سے لکھنا شروع کر دیتا تھا جس سے لوگوں کی دلچسپی بڑھنے لگتی تھی اور ڈوبتے ہوئے اخبار کو سہارا مل جاتا تھا۔ موقع ملنے پر دونوں اخبار فرقہ پرستی کا زہر پھیلانے لگتے تھے اور ایک دوسرے پر الزامات لگانے شروع کر دیتے تھے، نتیجتاً ان اخبارات کی اشاعت بڑھ جاتی تھی۔ جب ان کی دریدہ دہنی حد سے زیادہ بڑھ گئی تو سرکار نے اس کے ہندو مسلم ایڈیٹروں کو جیل میں بند کر دیا۔ اتفاق سے دونوں ایک ہی جیل خانے میں تھے۔ قید بھگتنے کے بعد رہائی عمل میں آئی تو دونوں نے گلے مل کر طمطراق سے کہا کہ گورنمنٹ نے ہمیں فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کے جرم میں سزا دی تھی لیکن ہم دونوں دوران اسیری بھائی بھائی کی طرح رہتے تھے۔ ۱۹۳۰ میں حمید نامی نے گوجرانوالہ سے 'زگزا' جاری کیا جو ہر نوعیت کی خبروں کو مزاحیہ رنگ میں پیش کرتا تھا۔ ایک سال چل کر یہ بند ہو گیا۔ لاہور سے لالہ شیام لال نے 'گورو گھنٹال' کی اشاعت شروع کی، پہلے یہ ہفتہ وار تھا مگر بعد میں اسے دوبارہ روزنامہ میں بدلنے کی کوشش کی جو کامیاب نہ ہو سکی۔ ملک کے بٹوارے کے بعد دلی سے چھپنا شروع ہوا مگر زیادہ دنوں تک نہ چل سکا۔

●○●

دارشکوہ اور سلطنت عثمانیہ (بقیہ صفحہ ۵ سے آگے)

کاغذات سفارت پیش کیے تھے۔(۲۲) علی
وزیر اسلام خان نے جو خط اپنے ہم رتبہ
ترکی وزیر اعظم کو لکھا ہے اس میں صاف
صاف یہ موجود ہے کہ شہنشاہ شاہجہاں
نے کشمیر ہی میں ارسلان آغا کو شرف
باریابی بخشا تھا۔(۲۳) شاہجہاں اور دارا شکوہ
۱۳ ستمبر ۱۶۳۰ء کو کشمیر سے چلے اور وسط
دسمبر ۱۶۳۰ء کے آغاز میں لاہور پہنچے۔
لاہور پہنچنے کے تھوڑے دن بعد ہی
شاہجہاں نے ارسلان آغا کو جنوری
۱۶۳۱ء میں استنبول کے لیے رخصت کیا۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس سے
ظاہر ہے کہ ہر اعتبار سے دارا شکوہ نے
اس وقت سلسلہ قادریہ کے پیرو سے اپنی
عقیدت کا اظہار کیا۔ وہ [illegible] بہت دن
پہلے کی بات نہیں تھی کہ اس نے تصوف پر
اپنی کتاب سفینۃ الاولیاء (۲۷ جنوری
۱۶۴۰ء) میں جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے اس نے
سلسلہ قادریہ اور ان کے مسلک سے اپنی دلی
وابستگی کا اظہار کیا تھا(۳۶) اور ملا شاہ بدخشی
کے مریدوں میں وہ [illegible] ان پہلے تو
شامل ہو گیا تھا، جب شاید ارسلان آغا بھی
کشمیر میں مقیم تھا۔ اس اعتبار سے یہ اچھا
موقع تھا کہ وہ شیخ عبدالقادر جیلانی اور
امام ابوحنیفہ کے مزارات کے لیے اپنے
نمائندے کی معرفت (تحفے تحائف بھیج
کر) ان سے اپنی عقیدت و احترام ظاہر
کرے۔ چونکہ بغداد جہاں یہ مزارات
ہیں سلطنت عثمانیہ میں تھا تو یہ موزوں ہی
تھا کہ اپنے اس عمل (ملا شوقی) کو ترکی
سفیر کے ساتھ ہی روانہ کر دے۔ اس
طرح یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے
کہ دارا شکوہ نے ملا شوقی کو بغداد کے
مزارات کے لیے نذرانے کے طور پر
تحفے تحائف اور ملا کی سفارت کے سلسلے
میں زیر تبصرہ خط لکھا تھا۔

حاصل کلام یہ کہ امید ہے کہ اس
مقالے سے یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ دور
مغلیہ کی ہندوستانی تاریخ کے کچھ پہلوؤں
کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے ترکی مآخذ کی
اہمیت ہے اور ہندوستانی تاریخ کے محققین
ہندوستان کے [illegible] کے سلسلے
میں ہندوستانی اور یورپی مآخذ کے علاوہ
دوسرے مآخذ کی طرف بھی متوجہ ہوں گے۔

NOTES

1. According to Dara Shukoh himself, he was born near Sagartal lake, Ajmer on 29 Safar 1024 A. H. (Monday, 20 March, 1615). See Dara Shukoh, *Safinat al-Aulia* Private Ms., f 90 a, quoted by Bikrama Jit Hasrat, *Dara Shukoh: Life and Works*, Visvabharti, (published by Indian Press, Allahabad), 1953, p 1. He was killed at the orders of Aurangzeb (r.1658- 1707) on 30th August, 1659. See Kali Ranjan Qanungo, *Dara Shukoh*, First published 1935, reprinted by S. C. Sarkar and Sons, Calcutta, 1952, Vol. I, p 231.
2. Dara Shukoh wrote *Safinat al-Aulia* (1640), *Sakinat al-Aulia* (1642), *Risala-i Haqnuma* (1646), *Hasnat al-Arifin* (1652) and *Majma-al Bahrain* (1655). He also translated from Sanskrit into Persian *Bhagwat Gita* (1657) and 52 Upanishads as *Sirr-i Akbar* (1657). Besides these works, he has also left a treatise on Sufism *Tariqat ul Haqiqat* and a Diwan *Iksir-i-Azam* and got *Yog Vashist* translated in to Persian (1656). For details see Bikrama Jit Hasrat, *Dara Shikoh: Life and Works*, pp 43-292.
3. For the career of Mustafa Pasha who was also known as Kemankesh Kara Mustafa and held the post of Grand Vezir between 1638-1644, see S. J. Shaw, *History of the Ottoman Empire and Modern Turkey*, Cambridge University Press, 1976, Vol I, pp 208,214-215,218. Mustafa Pasha was executed at the order of Sultan Ibrahim (r. 1640-1648) on 31st January, 1644.
4. Dara Shukoh's letter, see Ahmed Feridun Bey, *Munshat al-Salatin* Istanbul, 1848-49, Vol. ii, pp 61-62.
5. Muhammad Pasha Sokollu (1505 - 1579) was a Christian devshirme boy from Bosnia. He was appointed Grand Vezir in 1565. For details see S. J. Shaw, *History of the Ottoman Empire and Modern Turkey*, Cambridge University Press, 1976, Vol. I, pp 110-111, 182 and 228-288.
6. Sultan Murad III was the son of Sultan Selim II (r. 1566- 1574) and the grand son of Sultan Suleiman the Magnificent (r. 1520-1566). For the career of Murad III, see Shekir Kurukoglu, 'III Murad', *Islam Ansiklopedesi* Vol. viii, pp 615- 625. Also see S. J. Shaw, *History of the Ottoman Empire and Modern Turkey* Vol. I, pp 179-184.
7. J. H. Mordtmann and V. L. Ménage (eds), *The Encyclopedia of Islam* New Edition, Vol. ii, p 881.
8. Ibid, p 881.
9. Ibid, p 881.
10. Ahmed Feridun Bey, *Munshat al Salatin* Istanbul, 1848-49, Vol. ii, pp 61-62.
11. Bernard Lewis, 'The Mughals and the Ottomans', *Pakistan Quarterly*, Vol.viii, No. 2, 1958, p 9.
12. According to Palmira Brumett, a merchant state is 'a state which invests parts of its accumulated wealth in trading ventures for profit and whose elite military class do likewise. It designs its foreign policy with the clear intention of acquiring control of sources of commercial revenue rather than simply acquiring land for purpose of colonization and agricultural exploitation.' See Palmira Brumett, *Ottoman Sea Power and Levantine Diplomacy in the Age of Discovery*, State University of New York Press, 1994, p 5.
13. Bernard Lewis, 'The Mughals and the Ottomans', p 9. For a detailed analysis of Mughal-Ottoman relations, see N. R. Farooqi, *Mughal Ottoman Relations: A Study of Political and Diplomatic Relations Between Mughal India and the Ottoman Empire 1556-1748*, Idarah-i Adabiyat-i Delli, Delhi, 1989.
14. Sidi Ali Reis, *Mirat al Mumalik*, Persian translation, Mahmud Tafazulli and Ali Ganjali, Tehran, 1975, pp 201-204.
15. For details of this episode, see N. R. Farooqi, 'Six Ottoman Documents on Mughal - Ottoman Relations During the Reign of Akbar' *Journal of Islamic Studies* Oxford, Vol. VII, No. 1, January 1996, pp
16. *Munshat al-Salatin* Vol. ii, p 143.
17. For the career of Mir Zarif, see Samsamuddaulah Shahnawaz Khan and Abdul Hayy, *Maasir al Umara*, Ed. by Mirza Ashraf Ali, 3 Vols., Calcutta, 1885-1895, Vol.iii, pp 11-12.
18. *Munshat al-Salatin* Vol.ii, pp 67-69.
19. According to Naima, the real object of the Mughal embassy was to inform the Sultan that 'on the report of Sultan's march to Baghdad, the Shah of India had put himself in progress towards Candahar'. See Mustafa Naima, *Ravzat al Husaeyn fi Hulasat-i Akbar al-Hafikayn* ed. By Zuhuri Danishman, 6 Volumes, Istanbul, 1967-1969, Vol. 3, p 1402. The English factors in India had also reported that the purpose of the Mughal mission was to secure a Mughal-Ottoman alliance against Persia. See, William Foster (ed.), *The English Factories in India 1618-1669*, 13 Vols. Oxford: Clarendon Press, 1906-1927, Vol. 6 (1637-1641), p x. Also see *Munshat al-Salatin* Vol.ii, pp 63-64.
20. N. R. Farooqi, *Mughal - Ottoman Relations* pp 26-29. Also see Joseph De Hammer, 'Memoir on the Diplomatic Relations between the Courts of Delhi and Constantinople in the Sixteenth and Seventeenth Centuries', *Transactions of the Royal Asiatic Society of Great Britain and Ireland* Vol.ii, 1830, pp 466-468.
21. *Munshat al-Salatin* Vol.ii, pp 62-65.
22. For instance, Bikrma Jit Hasrat and K. R. Qanungo in their works on Dara Shukoh have not alluded to these letters. Even J. N. Sarkar in his monumental *History of Aurangzib* (5 vols.) has not taken any note of this episode.
23. Isari Abdullah Effendi, *Dastur al-Insha*, Ms., National Bibliothek, Vienna, Flugel 316, f 129a-b. See Joseph De Hammer, 'Memoir on the Diplomatic Relations', p 469. Also see Riazul Islam, *A Calendar of Documents on Indo - Persian Relations 1500- 1750*, Iranian Cultural Foundation, Tehran & Institute of Central and West Asian Studies, Karachi, 1982, Vol. II, p 322.
24. *Munshat al- Salatin* Vol. ii, p 60.
25. It should however be noted that in Abdullah Effendi's *Dastur al Insha* Dara Shukoh's name is mentioned in the rubric of the document.
26. Riazul Islam, *A Calendar of Documents on Indo - Persian Relations 1500-1750*, Iranian Cultural Foundation, Tehran & Institute of Central and West Asian Studies, Karachi, 1979, Vol. I, pp 143-148.
27. *Ibid*, pp 130-131.
28. *Ibid*, pp 225-227, 230-231.
29. I. A. Ghauri, *War of Succession between the sons of Shahjahan 1657-1658*, Lahore, 1964, p 108.
30. *Munshat al-Salatin* Vol.ii, pp 59-61.
31. Bikrama Jit Hasrat, *Life and Works of Dara Shukoh* pp 77-79. Also see K. R. Qanungo, *Dara Shukoh*, Vol. I, pp 72-73.
32. B. J. Hasrat, p 36, K. R. Qanungo, p 76.
33. B. J. Hasrat, p 82, K. R. Qanungo, p 76.
34. Abdul Hamid Lahori, *Padshah Nama* Ed. by Maulvi Kabiruddin Ahmad, 2 Vols., Bibliotheca Indica, Calcutta, 1867, Vol.ii, p 197. Also see, Muhammad Salih Kanboh, *Amal-i Salih*, Ed. by Ghulam Yazdani and revised by Waheed Qureshi, 3 Vols., Lahore, 1967-1972, Vol.ii, p 270.
35. *Munshat al Salatin* Vol. ii, p 63.
36. In *Safinat al-Aulia* Dara Shukoh has written that he has completed the book 'in my twenty fifth year, on Ramzan27, 1049'. See, B. J. Hasrat, *Dara Shukoh*, p 48. Also see K. R. Qanungo, *Dara Shukoh*, Vol. I, p 75.

([illegible] اسلامی ... جرنل ... ستمبر ۲۰۱۳ء)

■■

(دوسری اور آخری قسط)

دارا شکوہ اور سلطنتِ عثمانیہ

دارا شکوہ کی زندگی کا ایک اَنجانا پہلو

پروفیسر نعیم الرحمٰن فاروقی
پرو وائس چانسلر
الٰہ آباد یونیورسٹی، الٰہ آباد-211001

ترکی حکام شاید خط کے انداز یا نیت سے کچھ متاثر نہیں ہوئے اس لیے اس کی وصول یابی کی اطلاع بھی نہیں دی۔ دونوں مملکتوں کے تعلقات میں ۱۵۸۰ء کے بعد کچھ برسوں میں اور کمی آگئی جب ترکی حکومت نے اکبر کے گھرانے کی کچھ مستورات کو ان کی شریعت کے خلاف کچھ باتوں کی وجہ سے حجاز سے باہر نکال دیا۔[15] اس کے علاوہ سولہویں صدی کے نصف اواخر میں ایران اتنا مضبوط نہیں تھا کہ مغلوں کو اس سے خطرہ ہوتا، اس لیے اکبر نے کبھی بھی ترکوں سے تعلقات بڑھانے کی کوشش نہیں کی۔ اس لیے دونوں مملکتوں کے تعلقات التوا میں رہے۔ لیکن جہانگیر کے عہد (حکومت ۱۶۰۵-۲۷ء) کے آخر میں ایران کے مقابلے میں مغل ترکوں کے اشتراک کے مواقع بہتر ہوگئے۔

ایران کے شاہ عباس دوم (حکومت ۱۵۸۷-۱۶۲۹ء) نے ۱۶۲۲ء میں مغلوں کے قلعۂ قندھار کو اور ۱۶۲۳ء میں ترکوں کے قلعۂ بغداد کو فتح کرلیا تو مغل اور ترک ایک دوسرے کے قریب آگئے۔ ۱۶۲۵ء میں سلطان مراد چہارم (حکومت ۱۶۲۳-۴۰ء) نے جہانگیر کو نہایت دوستانہ خط بھیجا جس میں شہنشاہ (جہانگیر) کو یہ اطلاع دی گئی تھی کہ شاہ (ایران) کے خلاف ترکی فوج روانہ کی جاچکی ہے اور جہانگیر کو صلاح دی گئی تھی کہ وہ دوسری طرف سے ایران پر فوراً حملہ کردے۔[16] لیکن مغل سلطنت کے اپنے اندرونی/ ملکی مسائل اور ۱۶۲۷ء میں جہانگیر کی موت کی وجہ سے مغل سلطان مراد کے مشورے پر عمل نہ کرسکے۔

قندھار کے محاذ پر تذبذب کی وجہ سے اور اس خیال سے کہ کہیں قندھار پر مغل جو حملہ کرنے کی سوچ رہے تھے اس پر ایرانی ردعمل نہ ہو، شاہجہاں کو ترکوں کی تشفی کرنے کا خیال آیا۔ اس نے میر ظریف کو بطور سفیر استنبول روانہ کیا۔[17] میر ظریف کو ایک دوستانہ خط اور سلطان مراد کے لیے بیش قیمت ہیروں سے جڑی ہوئی ایک پیٹی دی گئی تھی۔ مغل وقائع نویس تو یہ بات زور دے کر کہتے ہیں کہ میر ظریف کا واحد مقصد صرف یہ تھا کہ شاہی اصطبل کے لیے گھوڑے خرید لائیں لیکن خط پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مغل سفارت کا اصل مقصد تھا کہ ایران کے خلاف مغل، ترک اور ازبکوں کا ایک مشترک محاذ بنایا جائے[18] اور اس بات کی تصدیق ترکوں کے سرکاری وقائع نویس مصطفیٰ نعیمہ اور ان یوروپی تاجروں کی شہادتوں سے بھی ہوتی ہے جو اس وقت ہندستان میں سرگرم تھے۔[19]

۱۶۳۰ء میں میر ظریف مغل دربار میں ترکی سفیر ارسلان آغا کے ساتھ ہندستان واپس آگئے۔ شاہی خط جو ترکی سفیر لائے تھے اس میں علاوہ القاب و آداب میں کوتاہی کے 'سلطان' کے شاہجہاں کے لقب ہی پر اعتراض کردیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ تم تو بس ہندستان کے حکمراں ہو پھر اپنے آپ کو ساری دنیا کا بادشاہ کیوں سمجھتے ہو۔ (ظاہر ہے) ایسی باتوں سے دونوں مملکتوں کے درمیان تعلقات پھر خراب ہوگئے۔ جنوری ۱۶۳۱ء میں ارسلان آغا کو پورے اعزاز اور بہت سے تحائف کے ساتھ رخصت کردیا گیا لیکن شاہجہاں نے جواب میں نہ کوئی سفیر استنبول بھیجا اور نہ ترک سلطان کے خط کا جواب دیا۔[20] مغل وزیر اسلام خاں نے البتہ اپنے ہم رتبہ ترکی وزیر مصطفیٰ پاشا کو شکایت کا خط لکھا کہ (ترکی) منشیوں کو شاہجہاں جیسے بادشاہ کو سرکاری مراسلت میں مناسب القاب و آداب کا استعمال کرنا بھی نہیں آتا، خط میں مغل فوجوں کی طاقت اور مغل ساقوں کی وسعت کا بھی شیخی آمیز پیرائے میں بیان کیا گیا تھا۔[21]

ان حقائق کے پیش نظر ترکی وزیر اعظم سے دارا شکوہ کی مراسلت اور خاص طور سے زیر تبصرہ دستاویز کو مناسب تاریخی پس منظر میں سمجھا جاسکتا ہے۔ مصطفیٰ پاشا کے نام دارا کا خط منشآت السلاطین میں نقل نہیں کیا گیا۔ کسی بھی مغل وقائع نویس نے شہزادہ (دارا شکوہ) اور ترکی وزیر اعظم کی مراسلت کا ذکر نہیں کیا۔ دارا شکوہ کے جدید سوانح نگاروں نے بھی شہزادہ دارا شکوہ کی زندگی میں اس قصے کا ذکر نہیں کیا۔[22] لیکن ملا شوقی کے ذریعے دارا کے اس خط میں جو بھیجا گیا تھا اس کا پتا ایک اور ترکی ماخذ سے چل جاتا ہے۔ اس ماخذ کے مطابق اس خط میں ملا شوقی کی معرفت جو زبانی پیغام بھیجا گیا تھا اس کا ذکر کیا گیا تھا اور ترکی کے وزیر سے کہا گیا تھا کہ وہ پیغام پہنچنے کی اطلاع دیں۔ شہزادہ دارا شکوہ نے پاشا سے یہ درخواست بھی کی تھی کہ اس کے خط کا جواب دیں اور یہ یقین بھی دلایا تھا کہ وہ آئندہ دونوں فریقین میں دوستانہ تعلقات بڑھانے کے لیے اپنے عامل بھیجتا رہے گا۔[23]

ملا شوقی کی سفارت کی تاریخ نہیں معلوم، نہ تو دارا شکوہ کے مصطفیٰ پاشا کے نام خط میں نہ پاشا کے جواب میں اس کے لکھے جانے کی تاریخ ہے۔ لیکن چوں کہ مصطفیٰ پاشا وزارت عظمیٰ کے عہدے پر ۱۶۳۸ء سے ۱۶۴۳ء تک متمکن رہے تو یہ بات یقینی ہے کہ یہ اسی عرصے میں لکھا گیا ہوگا۔ اس بات کی شہادت موجود ہے کہ ترکی سفیر ارسلان آغا کو جنوری ۱۶۳۱ء میں استنبول جانے کی اجازت دی گئی تھی اور وہ ۲۳ جمادی الاولیٰ ۱۶۳۲ء کو استنبول پہنچے تھے۔[24] اس لیے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ جب ۱۶۳۱ء میں ترکی سفیر واپس جارہے تھے تو ملا شوقی ان ہی کے ساتھ استنبول کے لیے روانہ ہوئے ہوں گے اور ۱۶۴۳ء میں ہندستان واپس آگئے ہوں گے۔

ملا شوقی کے مشن یا سفارت اور دارا کے خط دونوں کا مقصد مبہم ہے۔ خط میں یہ بات توجہ طلب ہے کہ اس میں سفارت کے مقصد کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا گیا۔ اس میں ان (بطور نذرانہ بھیجے ہوئے تحفوں) کا ذکر بھی نہیں ہے جو شہزادہ دارا شکوہ نے امام ابوحنیفہ اور شیخ عبدالقادر جیلانی کے مزارات کے لیے بھیجے تھے۔ صرف اس زبانی پیغام کا ذکر ہے جو شہزادہ دارا شکوہ کے نمائندے کو دیا گیا تھا۔ مصطفیٰ پاشا کا اس خط کا جواب بھی اتنا ہی مبہم ہے۔ اس کے مراسلے میں تو شہزادے کا نام ایک بار بھی نہیں لکھا گیا، صرف اس کے القاب سے کام لیا گیا ہے۔ حالی رقعہ کے ساتھ جو تحفے بھیجے گئے تھے ان کا ذکر تو ہے لیکن اس زبانی پیغام کا ذکر نہیں ہے جو نامہ بر کے ہاتھ بھیجا گیا تھا۔ اس خط میں ملا شوقی کا جو ذکر کیا گیا ہے بس اس سے مکتوب الیہ کا پتا چلتا ہے۔[25]

ملا شوقی کی سفارت کا ایک ظاہری مقصد یہ بیان کیا گیا ہے کہ دارا کی خواہش تھی کہ مغل تخت کے لیے جو متوقع ہونے والا ہے اس میں اسے سلطان ترکی کی حمایت حاصل ہوجائے۔ ہمیں معلوم ہے کہ تخت نشینی کی کشمکش میں اپنی حیثیت مضبوط کرنے کے لیے بھی مغل شہزادے در پردہ دوسرے ملکوں کے اعلا عہدیداروں سے خط کتابت کرلیتے تھے۔ اس کی ابتدا شہزادہ سلیم سے ہوئی جس نے شاہ عباس اول کو ۱۶۰۳ء اور ۱۶۰۵ء کے درمیان کئی خط لکھے تھے۔[26] اس کے بھائی دانیال نے بھی شاہ کو ایک خط لکھا تھا۔[27] دارا کے والد شہزادہ خرم نے بھی اسی طرح شاہ کی حمایت حاصل کرنے کے لیے ایرانی بادشاہ کے پاس اپنے سفیر بھیجے تھے۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب درباری سیاست کی وجہ سے شہزادہ خرم (شاہجہاں) اپنے والد (شہنشاہ جہانگیر) کی نظروں میں گرچکے تھے۔[28] لیکن دارا کے معاملے میں یہ بات قابل وثوق نہیں ہے وجہ صاف ہے کہ شاہجہاں کے بعد اس کے بیٹوں میں تخت نشینی کے لیے معرکہ آرائیاں ۱۶۵۷ء میں شروع ہوئی تھیں یعنی ملا شوقی کے روانہ ہونے کے کوئی سولہ برس بعد۔ شاہزادگان شاہ شجاع اورنگ زیب اور مراد بھی دارا شکوہ کے خلاف ۱۶۵۲ء میں متحد ہوئے تھے گویا دارا کے نمائندے کے استنبول روانہ ہونے کے گیارہ برس بعد[29] اس لیے یہ قرین قیاس نہیں ہے کہ شہزادہ دارا شکوہ نے اتنے پہلے اس صورت حال (تخت نشینی کے لیے لڑائیوں) کا اندازہ کرلیا ہوگا اور دوسرے ملک سے اپنی حمایت چاہی ہوگی۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اس نے اپنا نمائندہ اور تحفے تحائف استنبول اس لیے بھیجے ہوں کہ وہ تناؤ جو دو بادشاہوں کے درمیان ارسلان آغا کی معرفت آئے ہوئے سلطان ترکی کے خط میں بدتمیزی کی وجہ سے پیدا ہوگیا تھا وہ ختم ہوجائے لیکن یہ قیاس بھی مشکل ہی سے قابل یقین ہے کیوں کہ اس وقت (جب کہ دارا شکوہ کا صرف شہزادگی کا زمانہ تھا) دارا شکوہ کے خط اور تحفے تحائف کا استنبول میں کچھ وزن و وقار ہو ہی نہیں سکتا تھا اور اس بات کی تصدیق مغل وزیر اسلام خاں کے نام مصطفیٰ پاشا کے خط کے پرحکمت یا تحقیرانہ لب و لہجے سے ہوتی ہے جو شاید ملا شوقی ہی لائے تھے۔[30]

معلوم ہوتا ہے کہ دارا شکوہ کو سلسلۂ قادریہ سے دلی دلچسپی ۱۶۳۳ء میں ہوئی جب وہ اپنے والد کے ساتھ لاہور میں میاں میر سے ملا تھا۔ اس نے اپنی کتاب 'سکینۃ الاولیا' (۱۶۴۲ء) میں اس ملاقات کا مفصل حال لکھا ہے۔ صوفی صاحب کی روحانی بزرگی نے نوجوان شہزادے کو مسحور کردیا تھا اور وہ بعد میں چار مرتبہ اور ان سے ملنے گیا۔ ان ہی ملاقاتوں میں شاید دارا شکوہ نے سلسلۂ قادریہ میں باضابطہ بیعت کی۔[31] اپنی سابقہ کتاب 'سفینۃ الاولیا' (۱۶۴۰ء) کے خاتمے میں پہلے ہی شہزادہ دارا شکوہ نے اپنے بارے میں یہ الفاظ استعمال کیے تھے "دارا شکوہ حنفی قادری خلف شاہجہاں"۔[32] میاں میر کے انتقال (۱۶۳۵ء) کے بعد دارا شکوہ ان کے مرید خاص ملا شاہ بدخشی سے واقف ہوا۔ لیکن ۲۳ مارچ ۱۶۴۰ء سے ۱۳ ستمبر ۱۶۴۰ء کے درمیان کشمیر میں جہاں دارا شکوہ اپنے والد کے ساتھ مقیم تھا، دارا شکوہ ملا شاہ سے کئی مرتبہ ملا اور ان سے اپنا مرید بنا لینے کی درخواست کی۔[33] اور یہ ہم جانتے ہیں کہ کشمیر ہی میں ترکی سفیر ارسلان آغا نے مغل دربار میں اپنے

(بقیہ صفحہ … پر)

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں — مطبوعہ: [illegible] آفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲، راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ): دو روپے، سالانہ: ۸۵ روپے (بیرونی ممالک آٹھ امریکی ڈالر)
Phones: 23237212, 23237214
E-mail: hamarizaban@atuh.org http://www.atuh.org